رفیق محمد

انسان کے حقوق کا مسئلہ
مذہبی اور عالمی تناظر میں

انسان کے حقوق کی بات جتنی سادہ لگتی ہے اتنی ہے نہیں۔ انسان جس معاشرے میں رہتا ہے اسکا اثر اسکی سوچ پر پڑنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ہم اسلامی معاشرے میں رہتے ہیں تو معاً اسلامی نظریے کی طرف دھیان جائے گا۔ اور ہم اسلامی نظریے کو ہی معیار سمجھتے ہیں۔ یہ ایک فطری بات ہے۔

لیکن کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ ہم اسلامی معاشرے میں رہتے ہوئے بھی عالمی ثقافت سے دور نہیں رہ سکتے؟ اب یہ دیکھنا ہے کہ عالمی ثقافت کیا ہے اور کیا اس سے بچا جا سکتا ہے؟ اس اجتناب کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہم اسلامی ثقافت کو عالمی ثقافت سے غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔ اور ہم اس خوف میں مبتلا ہیں کہ اسلامی ثقافت عالمی ثقافت کا مقابلہ اس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک ہم ارادی طور پر اسلامی ثقافت پر محافظ بن کر کھڑے نہ رہیں۔ گویا مسلمان کا کام یہ رہ گیا ہے کہ وہ ہر وقت اس فکر میں مبتلا رہے کہ اسلامی ثقافت کسی طرح عالمی ثقافت کے نرغے میں نہ آ جائے۔ اور یہ فکر اس لئے دامن گیر ہے کہ عالمی ثقافت موجود ہے اور اس لئے بھی کہ اسلامی ثقافت ہر نئے ماحول میں ایک دائمی خطرے سے دو چار ہے۔ ہم اس مغالطے میں جب تک رہیں گے اپنی سوچ کو مثبت انداز دینے سے قاصر رہیں گے۔

مثبت سوچ کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم اللہ تعالی کے پیدا کردہ ہر ماحول کو نعمت سمجھیں

البتہ جو اعمال اخلاق اور اخلاص سے عاری ہوں ان سے اجتناب کریں۔ کیا عالمی ثقافت میں بالکلیہ صرف بری اقدار ہی روا رکھی گئی ہیں یا معاملہ کچھ اور ہے؟

آیئے دیکھیں کہ عالمی ثقافت کیا ہوتی ہے اور یہ کس طرح وجود میں آتی ہے۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے کہ وہ ہر روز ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔ یہ نئی شان کیا ہے جسے اللہ تعالی نے اپنا وطیرہ بنایا ہے؟ یہ نئی شان اسکی دمادم تخلیق ہے۔ یہ وہی کن فیکون ہے جسے اللہ تعالی نے اپنا تخلیقی وطیرہ فرمایا ہے۔ کیا مسلمان کبھی سوچ سکتا ہے کہ اللہ تعالی تخلیق کے عمل کو خیر باد کہہ کر کائنات میں جمود کو اسکا مقدر بنا دے گا؟ اگر مسلمان کا ایمان سلامت ہے تو اسکی سوچ کبھی ایسی نہیں ہو سکتی۔

لیکن بصد افسوس کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان اللہ تعالی کی اس تخلیق کو صرف مادی سطح پر جاری رکھنے کا قائل رہ گیا ہے۔ معنوی اور جمالیاتی سطح پر تخلیق کو مسلمان یا تو سمجھ نہیں پاتا یا سمجھنا نہیں چاہتا۔ انسان کے بارے میں خدا کا یہ ارشاد مسلمان کو کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ اے انسانو تم ضرور بالضرور ایک سطح سے اگلی سطح پر جاؤ گے۔ لترکبن طبقا عن طبق (۸۴۔۱۹)۔ انسانوں کا یہ کونسا ارتقاء ہے جس پر انہیں بہر صورت جانا ہے۔ کیا یہ صرف جسمانی اور مادی لرتقاء ہے یا اس میں اسکی شعوری اخلاقی اور جمالیاتی سطحیں بھی شامل ہیں؟ اگر یہ بھی انسانی ارتقاء کا حصہ ہیں تو پھر کیا عالمی ثقافت میں انسان ان جہتوں پر آگے نہیں بڑھ رہا؟ کیا مکان بنانے سے لیکر اعلی انسانی رویوں تک عالمی انسانی ثقافت انفرادی سطح سے بلند ہو کر اجتماعی سطح کو چھونے کی کوشش میں نہیں ہے؟

آج جو اجتماعی ادارے مثال کے طور پر یو این او اور یونی سیف تشکیل پا چکے ہیں کیا ان کا تصور آج سے ایک ہزار سال قبل کیا جا سکتا تھا؟ آپ ان اداروں کی کارکردگی پر حرف گیری کر سکتے ہیں لیکن انکی افادیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ ادارے انسانی حقوق کی بازیابی میں جو کام کر رہے ہیں اور جس سطح پر کر رہے ہیں کیا

عالمی ثقافت کے تصور سے پہلے یہ ممکن تھا؟ اور اگر یہ عالمی ادارے اپنے کام میں مصروف ہیں تو کیا انہیں انسان کی ترقی قرار دیا جائے گا یا تنزل؟ اور کیا یہ قرآن کی اس آیت کی تعبیر سے مطابقت رکھتی ہے یا نہیں؟ اور اگر رکھتی ہے تو پھر یہ معرکہ خدا کی اس تخلیق اور حکمت کا حصہ ہے یا نہیں؟ اسلام کے اعلیٰ تصور حیات کے تحت دیکھیں تو انسان کا ایک مرحلہء ثقافت سے اگلے مرحلہء ثقافت کی طرف سفر کرنا خدائی منصوبہ ہے۔ اور اس میں نہ تو کچھ غیر اسلامی ہے اور نہ کچھ غیر انسانی۔

اگر عالمی ثقافت ایک خدائی تخلیق کے سوا کچھ نہیں ہے تو کیا مسلمان کا وہ رویہ جس کے تحت وہ عالمی شعور اور عالمی ثقافت سے خوفزدہ لگتا ہے درست ہوا یا غلط؟

مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ سمجھنا مشکل نہیں رہے گا کہ انسانی حقوق کی بحث بھی آج کے عالمی ثقافتی تناظر کے بغیر ادھوری رہے گی۔ اور یہ کہ یہ بات اسلامی سوچ سے غیر ہم آھنگ نہیں ہے۔ نیز یہ کہ حقوق کی معرفت عالمی تناظر میں ہونی چاہئے اور یہ بات بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ اگر بازیاب شدہ حقوق انسانیت کے اعلیٰ تقاضوں سے ہم آھنگ ہوں تو اسلام کے ان اعلیٰ تقاضوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس بارے میں اگر کسی کے ذہن میں کچھ ابہام ہو تو آیئے قرآن کے اس خالص انسانی رویے کی طرف نگاہ کریں جو اس نے انسانی رویوں کی درستگی کیلئے اختیار کیا ہے۔ قرآن کا فرمان ہے **لیس للانسان الا ما سعی**(۵۳.۳۹) یعنی انسان کو وہی کچھ حاصل ہوگا جسکی اس نے کوشش کی ہوگی۔ یہ ایک خالصتاً انسانی معیار پر کی ہوئی نصیحت ہے۔ اس میں اگر کچھ گہرائی کا عنصر ہے تو اس قدر کہ کوشش کرتے وقت انسان میں خلوص اور اعلیٰ پن کا ہونا ضروری ہے۔ یہ بات اس لئے کہی جارہی ہے کہ قرآن مجید انسان سے تخاطب میں انسان کی روحانیت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ یعنی انسان کا اعلیٰ پن اور اعلیٰ معاشرتی تقاضے پیش نظر ہوں تو انسان کا کیا ہوا کام اسلامی زبان میں ایک خدائی کام بن جاتا ہے۔ ہاتھ ہے اللہ کا بندہء مومن

کا ہاتھ۔ صرف یہی نہیں قرآن اس سے بھی ایک ہاتھ آگے جاتا ہے۔

وما تشائون الا ان یشائالله کہہ کر اللہ تعالی نے انسان کی نیک نیتی کو بھی اپنی نیت قرار دیا ہے۔ اس میں کیا راز ہے یہ جاننے کے لئے ہمیں ابھی چار قدم اور آگے جانا پڑیگا۔ اس مقدمے میں جو اصل نکتہ ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالی نے مشیت کا حقدار کس کو قرار دیا ہے۔ آیت کا لفظی ترجمہ اردو میں کچھ یوں ہے:

اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ اس عبارت سے اردو اور عربی دونوں میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ بندہ چاہے تو اللہ چاہیگا اور یہ بھی کہ اللہ کے چاہے بغیر بندہ نہیں چاہ سکتا۔ یہ آیت قرآن مجید میں دو مرتبہ آئی ہے۔ ایک کا سیاق یہ ہے کہ سورہ انسان میں:

نحن خلقناهم و شددنا اسرهم و اذا شئنا بدلنا امثالهم تبديلا. ان هذه تذكرة فمن شاء اتخذ الى ربه سبيلا. و ما تشائون الا ان يشائالله ان الله كان عليما حكيما.

یعنی ہم نے ان لوگوں کو پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ مضبوط کئے ہیں۔ اور جب چاہیں ان جیسے اور پیدا کر دیں۔ بیشک یہ ایک نصیحت ہے۔ بس جو چاہے اپنے رب کی طرف راہ اپنا لے۔ اور تم نہیں چاہو گے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ بے شک اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

دوسری مرتبہ یہی الفاظ سورہ التکویر میں اس طرح آئے ہیں:

ان هو الا ذكر للعلمين . لمن شاء منكم ان يستقيم. و ما تشائون الا ان يشائالله رب العالمين.

یعنی یہ قرآن تمام جہانوں کیلئے نصیحت ہے۔ ہر اس شخص کیلئے جو استقامت چاہتا ہے۔ اور تم نہیں چاہو گے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ وہ تمام جہانوں کا رب ہے۔

ان مقامات کے سیاق کو پیش نظر رکھتے ہوئے انسان کا کسی عمل پر آمادہ ہونا خود

انسان پر بھی ہے اور اللہ تعالی پر بھی ہے۔ گویا دونوں کا چاہنا کسی عمل کی وجہ بنتا ہے۔ آیئے علامہ اقبال کی طرف رجوع کریں اور دیکھیں کہ وہ اس گتھی کو کیسے سلجھاتے ہیں۔

علامہ کے نزدیک اللہ اور انسان کے درمیان جو رشتہ ہے اسے علامہ نے انسانی خودی اور اللہ کی خودی کے درمیان رشتے سے تعبیر کیا ہے۔ وہ اللہ تعالی کو بھی ایک خودی قرار دیتے ہیں اور انسان کو بھی۔ ان دونوں میں فرق اتنا ہے کہ اللہ تعالی لامحدود خودی ہے اور انسان ایک محدود خودی ہے۔ یہ خیال ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے جس میں اللہ تعالی نے فرشتوں سے فرمایا تھا:

فاذاسویتہ و نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین.
(۲۹.۱۵) یعنی اے فرشتو جب میں آدم میں اپنی روح پھونک دوں تو تم آدم کیلئے سجدے میں گر جاؤ۔

علامہ انسان اور خدا دونوں کی روح کو ایغو سے تعبیر کرتے ہیں اور ان میں صرف محدود اور لامحدود کا فرق روا رکھتے ہیں۔ اسی لئے انسان کے اپنے گہرے باطن سے چاہنے کو خدا کا چاہنا قرار دیتے ہیں۔ یوں بھی دیکھا جائے تو اس آیت کا اور کوئی معقول مفہوم نہیں بنتا جس میں انسان کے چاہنے کو خدا کے چاہنے پر منحصر قرار دیا گیا ہے۔ انسانی روح کو خدا نے امر ربی سے ہونا قرار دیا ہے: **یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی و ما اوتیتم من العلم الا قلیلا**.(۸۵.۱۷) اگر امر رب کو روح کا سبب قرار دیا گیا ہے اور خود اپنی روح کو آدم میں پھونکا ہے تو گویا انسان میں امر کی صلاحیت بھی عطا کی ہے۔ اب اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اللہ تعالی نے آدم کو امر یعنی اختیار سے نوازا ہے۔ اور اصل اختیار جب صرف اللہ تعالی کے پاس ہے تو اسی اصل اختیار میں سے انسان کو بھی عطا کیا ہے۔ انسان کے محدود خودی رکھنے کی وجہ سے انسان کا اختیار محدود تو ہوسکتا ہے لیکن انسان بے اختیار نہیں ہوسکتا۔

اب یہ بھی طے ہے کہ اس اختیار میں مسلمان اور غیر مسلم سب ہی شریک ہیں۔ جس طرح مسلمان اپنے اختیار کے غلط استعمال پر سزا کا مستحق ہوتا ہے اسی طرح غیر مسلم بھی اختیار کے غلط استعمال پر سزا پاتا ہے۔ تمام اخلاقی عیوب مسلم اور غیر مسلم کیلئے برابر کے عیوب ہیں۔ کیونکہ یہ ایک انسانی مسئلہ ہے مذہبی نہیں۔ انسانی حقوق کے حوالے سے یہ بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے اگر چہ مذہبی حوالہ بھی اس حقیقت کو تسلیم کر رہا ہے۔ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جو اعلی انسانی حوالوں کو نظر انداز کر سکے۔ خدا نے مذاہب اسی لئے بھیجے تھے کہ انسانی اعلی پن نکھر کر سامنے آئے اور بنی نوع انسان اس اعلی پن کے ذریعے اپنے خالق کی رضا حاصل کر سکیں۔

اسلام کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ واضح ہے کہ اللہ تعالی نے اپنے آخری نبی ﷺ کو اعلی اخلاق کی تکمیل کیلئے مبعوث فرمایا تھا۔ آپ کا یہ فرمان کسی مسلمان سے اوجھل نہیں ہے:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ یعنی آپؐ نے فرمایا کہ مجھے رسول بنا کر بھیجنے کا واحد مقصد اعلی اخلاق کی تکمیل ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اعلی اخلاق کی بنیاد انسان کا خلوص اور انسان دوستی ہے۔ اس لئے یہ کہنے میں کچھ حرج نہیں کہ دین کی اساس اعلی اخلاق ہے۔ اور کسی مذہب کے بارے میں یہ بات کہی جا سکے یا نہ لیکن اسلام کے بارے میں انتہائی وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اسکی بنیاد اصل میں اعلی اخلاق انسانی ہی ہے۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں اعلی اخلاق بنیادی حیثیت رکھتے ھیں تو اس میں کچھ شک نہیں رہ جاتا کہ انسانی حقوق کی بازیابی جو اعلی اخلاق کا اصل ثمرہ ہیں کسی طرح اسلام کی نظر سے اوجھل نہیں رہ سکتے۔

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ اسلام دیگر مذاہب سے اس ضمن میں کیسے ممتاز ہے۔

اسلام اپنے آپ کو دین کی اصطلاح سے متعارف کرواتا ہے۔ جس کا مفہوم

فرمانبرداری کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ تعالی کے حوالے کرنا بنتا ہے۔لیکن یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس دین نے انسان کو اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرنے کے علاوہ اور کیا ہدایات دی ہیں۔ خود اسکی الہامی ہدایت یعنی قرآن مجید نے انسان کو کیا مقام دیا ہے۔اور یہ جاننا بھی بہتر ہوگا کہ انسان کو خدا کی بندگی کا سبق دینے والے بڑے بڑے مذاہب نے انسان کو خدا کی فرمانبرداری کے ساتھ اور کیا ہدایات دی ہیں جن سے اس مذہب کی پہچان باقی رہتی ہے۔

ہم آریائی مذہب ہندومت سے آغاز کرتے ہیں۔اس مذہب میں انسان میں بھی روح ہے اور پرم آتما میں بھی ۔ انسانی روح کو پرم آتما میں جذب ہونا ہے لیکن اس کیلئے ہزاروں لاکھوں جنم درکار ہیں۔انسان کو اپنی دنیاوی اغراض سے آہستہ آہستہ دور ہوتے جانا ہے اور اپنے گہرے باطن کی طرف رجوع کرنا ہے جہاں خود خدا جلوہ افروز ہے۔ ہندومت میں انسانی جذبات اور اسکی جسمانی ضرورتیں اسکی دشمن ہیں۔ان سے بہرصورت چھٹکارا پانا ضروری ہے۔ ہندومت میں یہ سب کچھ انتہائی دھیرج سے کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس مذہب میں انسان جس حال میں ہے ٹھیک ہے۔ البتہ اعلی پن کی طرف سفر کرنا خود انسان کے بھلے میں ہے۔اس لئے اپنے گہرے باطن میں جا کر جب بھی اپنی اصلیت یعنی پرم آتما سے ہمکنار ہو جائے اس کے لئے بہتر ہے۔ ہندومت میں سارا معاملہ انسان کے پہل کرنے پر منحصر ہے۔

اس مذہب کی رو سے انسانی حقوق کا سوال اتنا اہم نہیں بنتا جتنا اس کا خدا میں جذب ہونا اہم ہے۔انسان ہر کیفیت میں زندہ ہیں اور اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔تبدیلی صرف خدا میں جذب ہونے کی طرف ہونی چاہئے اور کسی طرف تبدیلی کچھ خاص اہم نہیں۔اس لئے کہ انسان کسی بھی حالت میں ہو وہ خدا کی طرف اپنے مقام اور منصب نبی کے لحاظ سے بڑھے گا۔اس طرح دیکھیں تو ہندو دھرم میں انسان کی روح کی بالیدگی اور اس کا پرم آتما میں جذب ہونا تو اہم ہے لیکن اس کی معاشرتی زندگی اور اسکے دیگر حقوق کی بات پر زیادہ زور نہیں دیا

گیا۔ بلکہ یہ لگتا ہے کہ انسانوں کے مختلف معیاروں اور صلاحیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں اسی ذات پات یعنی Caste system میں زندگی بھر رہنے کی تعلیم نے انسانی حقوق کو اول درجہ کی بحث نہیں مانا۔ اسکا دھیرج والا مزاج اسے ایک گونہ امتیاز تو بخشتا ہے لیکن معاشرتی اصلاح کیلئے کوئی فوری پیغام نہیں دیتا۔

بدھ مت دوسرا آریائی مذہب ہے۔ اس کے مطابق انسان ایک لامحدود صلاحیت کا مالک ہے۔ اسے اپنی اس حیثیت کو پہچاننے میں صرف ایک چیز رکاوٹ ہے اور وہ ہے اسکی خود غرضی۔ انسان کو خود غرضی سے نجات حاصل کرنے کیلئے بڑی سخت محنت اور گہرے شعور کی ضرورت ہے۔ اس کیلئے بدھ مت میں آٹھ نکات پر مبنی ایک پروگرام دیا گیا ہے جس پر گامزن ہوکر انسان اپنے آپ کو خود غرضی کے تنگ ماحول سے نکال کر لامحدود صلاحیت حاصل کرسکتا ہے۔ جسے نروان کا نام دیا جاتا ہے۔ نروان کے حصول پر انسان اپنی خود غرضی سے نجات پاکر تمام ذوی الارواح کے ساتھ ایک ہو جاتا ہے اور جو چیز اس کیلئے محدودیت کا باعث تھی اس سے نکل جاتا ہے۔ یوں اس میں ایک لامحدودیت پیدا ہوتی ہے جو اس کا اصل مقصود ہے۔ ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب اچھے اور برے کی تمیز بھی مٹ جائے گی اور سب کچھ اچھا ہی اچھا ہوگا اور یہی نروان کی کیفیت ہے جو انسان کا مطلوب ہے۔ جسمانی اور شعوری وہ محنت جو نروان حاصل کرنے کیلئے از بس ضروری ہے یہی بدھ مت کا اصل پروگرام ہے۔ اس کے ثمرات کی کچھ حد نہیں ہوتی۔

بدھ مت میں اصل پروگرام ہی دوسروں کو اپنے جیسا سمجھنا اور تمام ماحول کو نروان بنانا ہے۔ اس لئے انسانی حقوق کا مسئلہ بدھ مت میں انسانی فرض ہی کی صورت میں حل ہو جاتا ہے۔ یعنی جب ہر شخص خود غرضی کی دلدل سے باہر نکل آئے گا تو حقوق انسانی از خود پورے ہونا شروع ہو جائیں گے۔ بدھ مت نے اس مقصد کے حصول کیلئے ایک بہت بڑا قدم یہ اٹھایا کہ مذہبی پیشوائیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ مہاتما بدھ کی تعلیم یہ ہے نروان حاصل کرنے

کیلئے کسی مذہبی پیشوا کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کام ہر انسان کو اپنے لئے خود ہی کرنا ہے۔ یوں بدھ مت آریائی مذاہب میں یہ امتیاز رکھتا ہے کہ اس نے ہندومت کی برھمنیت سے اپنے پیروکاروں کو آزاد کر کے انفرادی طور پر نروان حاصل کرنے کی تعلیم دی۔ دوسرے تمام انسانوں کو اپنی طرح کا انسان سمجھنے کا ایک لازمی فائدہ یہ ہوا کہ بدھ مت میں مذہبی پیشوائیت کی ضرورت نہ رہی۔ اگرچہ مہاتما بدھ کے بعد اس کی گنجائش پھر نکال لی گئی۔

آیئے اب کچھ بات سامی مذاہب کی ہو جائے۔ ان میں سب سے پرانا مذہب یہودیت ہے۔ اس مذہب میں خدا کی توحید کی بات بڑی شد و مد سے کی جاتی ہے اور خدا کے احکام پر سختی سے عمل کرنے کی تاکید پائی جاتی ہے۔ یہ مذہب جتنا زور خدا کے حکم پر دیتا ہے اور کسی بات پر نہیں دیتا۔ کیونکہ خدا کا حکم یعنی Commandment ہی ان کے ہاں سب سے اہم چیز ہے اس لئے خدا کے حکم پر عمل کرنا ہر صورت میں لازمی ہے۔ خدا کی نافرمانی کا شائبہ بھی پیدا ہو جائے تو یہودیت کے لئے قابل سزا ہے۔ جس سختی کا تقاضا اس مذہب میں ملتا ہے اسکی وجہ سے یہودی اپنے آپ کو ایک چنیدہ قوم قرار دیتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا نے اس قوم کو اس لئے منتخب کر رکھا ہے کہ ان سے ذرا سی نافرمانی بھی سخت سزا کا موجب ہوتی ہے۔ یہودی نظریئے کے مطابق یہ مقام انہیں اس لئے عطا ہوا ہے کہ کوئی اور قوم اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ دنیا بھر کی اقوام کیلئے یہودی اپنے آپ کو نعمت شمار کرتے ہیں کیونکہ جو سزا کسی قوم کو خدا کی نافرمانی پر سبق سکھانے کیلئے ملنی چاہئے تھی اس کا مظاہرہ یہودی قوم کے ذریعے کر دیا گیا ہے۔ اس لئے یہ امتیاز اسی قوم کو حاصل ہے کہ خدا نے انہیں اس عظیم کام کیلئے منتخب کیا۔

حقوق انسانی کی بات اس مذہب میں براہ راست نہیں کی گئی بلکہ اطاعت کے فرض کے ذریعے اس مقصود کو حاصل کیا جاتا ہے۔ حکم کے آگے اطاعت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہودیت میں حقوق کی بات اطاعت میں پوشیدہ ہے۔

ایک اور نہایت اہم مذہب نصرانیت ہے جس کا اصل نقطہء اہمیت یہ ہے کہ نصرانیت انسان کو اس مقام عظیم کے لائق سمجھتی ہے جس پر خود خدا فائز ہے۔ اس مذہب میں یہ ماننا ضروری ہے کہ جناب یسوع مسیح بہ یک وقت مکمل طور پر خدا بھی ہیں اور مکمل طور پر انسان بھی۔ یوں دیکھا جائے تو یہ مذہب انسانی تاریخ میں وہ بات کھل کر کہ پایا ہے جو دوسرے مذاہب در پردہ کہتے آئے ہیں۔ انسان کی مذہبی تاریخ کو غور سے دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ مذہب انسان کو خدا سے اور خدا کو انسان سے ہمکنار کرنے کی ایک سعی ہے۔ نصرانیت نے انسان اور خدا کے درمیاں حائل ہونے والے تمام پردے ہٹا دئے اور انسان کو اس پرانے تصور سے نجات دیدی جس میں انسان بنیادی طور پر گناہگار سمجھا جاتا تھا۔ یہ پہلا مذہب ہے جس نے انسان کو یہ حوصلہ بخشا کہ وہ خدا سے دور نہیں ہے بلکہ خدا اگر بنی نوع انسان کے جہان میں پوری طرح جلوہ گر ہونا چاہے تو اسے کوئی عار نہیں۔ مقام انسانیت کو اس مذہب نے جو رفعت بخشی ہے وہ اپنی جگہ پر ایک بہت بڑا قدم ہے۔ اس مذہب کے آنے کے بعد اور اس سے پہلے کی فکری اور ثقافتی تاریخ میں ایک نمایاں فرق ہے۔

اس مذہب نے اس بات کا آغاز کر دیا جس کا صدیوں سے انتظار تھا۔ انسان نے اپنی تاریخ میں آہستہ آہستہ اس آگہی کو پایا ہے جسے ہم انسانیت کا اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا کہتے ہیں۔ آریائی اقوام میں ہندومت نے جس راز کو فاش کیا تھا وہ یہ تھا کہ انسان اور خدا روح کے لحاظ سے ایک ہیں۔ خدا کی روح ہی انسان کو متحرک رکھتی ہے لیکن انسان اپنی غفلت کی وجہ سے اس بات کا ادراک نہیں کر پا رہا۔ اس غفلت سے انسان کو جگانے کا نام آریائی مذاہب میں ہندومت ہے۔ بدھ مت نے آکر اس حقیقت کو واضح کیا کہ کہ صرف اس بات کو چند ماہرین مذہب تک محدود رکھنا اس کی حقیقت کو واضح نہیں ہونے دیگا۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ اس نقطہء عظیم کو عام انسان کے کام کی چیز بنایا جائے تا کہ اس حقیقت پر محض مذہبی طبقے کا قبضہ نہ رہے۔ سامی اقوام میں یہی کام نصرانیت نے کیا ہے۔ لیکن یہاں بھی وہ اندیشہ ایک عرصہ

کارفرما رہا جو آریائی مذاہب میں رونما ہوا تھا۔ یعنی اس عظیم راز پر صرف مذہبی طبقے کا اجارہ رہا۔ نصرانیت نے اس طوق کو اپنی گردن سے اتارنے میں بہت دیر کردی لیکن آج نصرانی دنیا میں وہ طوق اتر چکا ہے۔ البتہ اسکی کمزور سی جھلک اب بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ آج اگر حقوق انسانی کی بات نصرانی ماحول سے اٹھ رہی ہے تو اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ خدا اور انسان کے درمیان فاصلے کو نصرانیت نے ہی ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ جب مذہبی زنجیریں انسان کی فہم وادراک میں بھاری محسوس ہونے لگیں تو انسان کو یہی احساس اپنے پاؤں پر کھڑا رکھ سکتا تھا کہ خدا اور انسان ایک دوسرے سے نہ صرف دور نہیں ہیں بلکہ وہ اعلی مقاصد میں ایک ہیں۔ بدھ مت کے اثرات کے تحت آریائی اقوام میں بھی اس کار خیر کی ابتدا ہو چکی تھی۔

سامی اقوام میں آج سے کوئی ڈیڑھ ہزار سال پہلے ایک اور مذہب آیا جسے مذہب کی بجائے دین کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ مذہب کا لفظ اردو میں راستے کا مفہوم رکھتا ہے جبکہ دین کا لفظ انسان کی اپنی پوری شخصیت کو کسی مقصد عظیم کیلئے وقف کرنے کا نام ہے۔ اس دین کا نام اسلام ہے۔ جو اپنے لفظی معنی میں تو سر جھکانے کا مفہوم رکھتا ہے لیکن اصل میں اپنی زندگی کو اللہ تعالی کے حوالے کرنے کا ایک پروگرام ہے۔ زندگی کی یہ امانت جو انسان کو ایک محدود وقت کیلئے سونپی گئی ہے انسان اسے کیسے استعمال کرتا ہے یہ انسان کیلئے ایک امتحان ہے جس میں وہ پورا اترے تو اسکی کامیابی ہے ورنہ ناکامی۔

اسلام کے ذریعے جو بندھن خدا اور بندے کے درمیان وجود میں آیا وہ اطاعت سے بڑھ کر اعتماد کا بندھن ہے۔ خدا نے فرشتوں کو گواہ بنا کر جس رفعت انسانی کی بات کی ہے وہ فرشتوں کو انسان کے مقام سے یوں متعارف کرواتی ہے کہ اب یہ انسان زمین پر میرا خلیفہ ہوگا۔ یعنی میرا یہ نائب جو کرے گا اس پر میں کوئی فوری گرفت نہیں کروں گا بلکہ اس کے کئے کا جب تک واضح نتیجہ سامنے نہیں آتا میری طرف سے انسان کو مہلت ہوگی۔ جب نتیجے سے یہ

ثابت ہوگا کہ انسان نے جو کام کیا تھا غلط تھا تب میرا اختیار اس ضمن میں حرکت میں آئے گا۔ وہ کیا ہوگا اس کا ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ وقت بتائے گا۔ جس کو میں نے اپنا نائب بنایا ہے اسے اپنی ذمہ داری پر کام کرنا ہے اور مجھے اپنے نائب پر اعتماد ہے کہ وہ منافقت سے کام نہیں لے گا۔ البتہ اس سے کسی جگہ پر غلطی ہوسکتی ہے۔ لیکن چونکہ میں نے خود یہ زندگی گذارنے کی ذمہ واری انسان کو سونپی ہے۔ اس لئے جب تک وہ نیک نیتی سے کام کرے گا اپنا اعتماد قائم رکھے گا۔ انسانی حیات میں یہ ایک بہت بڑا انقلاب ہے۔

اسلام نے یہ بات کر کے انسان کو ایک شرف بخشا ہے جس کا حق دار وہ صرف اس وقت تک ہے جب تک اپنے اعتماد کو خدا کی نظر میں قائم رکھے۔ انسان کو خلافت کے مقام پر فائز کرکے اللہ تعالی نے اسے جو رفعت بخشی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ خدا نے اپنے اختیار کو اس حد تک محدود کرلیا جس حد تک انسان کو اختیار دینے کا تقاضا تھا۔

اسلام میں یہ مقام انسان کو عطا ہوا ہے۔ اور یہ بات بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونی چاہئے کہ اسلام ختم نبوت کا دعوی بھی رکھتا ہے۔ ختم نبوت کے صحیح مفہوم کو پانا بھی مسلمانوں کیلئے اور باقی اقوام عالم کیلئے از بس ضروری ہے۔ اب کسی نبی کا آنا ممنوع اس لئے نہیں ہے کہ اب خدا کو انسان سے کچھ نہیں کہنا۔ اب خدا کا کلام انسان کے ساتھ کسی اور پیرائے میں ہوتا ہے۔ اسلام کے پیغام میں اس نکتے کو علامہ اقبال یوں بیان کرتے ہیں کہ آج انسان اپنے تجرباتی ماحول میں اس قدر آزاد ہے کہ محض روایتی عقلی ڈھانچوں سے ہی کام نہیں لے گا بلکہ اپنے تجربے کی بنا پر نئے اسلوب افکار کو بھی تشکیل دے گا۔ یعنی Deductive انداز فکر سے آگے بڑھ کر Inductive انداز فکر بھی اپنائے گا۔ اور یہ بات صرف اہل اسلام ہی کیلئے مخصوص نہیں ہے دنیا میں انسان اتنا عاقل اور بالغ ہوگیا ہے کہ اسے اب اپنی عقل اور فہم سے وہ مراحل طے کرنے ہیں جن کیلئے وہ اس سے قبل اہل نہیں تھا۔ اب انسان کو قرآن کی نص ہی کے مطابق دو اور منابع علم سے استفادہ کرنا ہے۔ وہ منابع علم کائنات کے مطالعے اور خود

انسانی باطن کے مطالعے میں پوشیدہ ہیں۔ علامہ کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

The Prophet of Islam seems to stand between the ancient and the modern world. In so far as the source of his revelation is concerned he belongs to the ancient world ; in so far as the spirit of his revelation is concerned he belongs to the modern world. In him life discovers other sources of knowledge suitable to its new direction. The birth of Islam, as I hope to be able presently to prove to your satisfaction, is the birth of inductive intellect. In Islam prophecy reaches its perfection in discovering the need of its own abolition. This involves the keen perception that life cannot for ever be kept in leading strings; that in order to achieve full self-conscious-ness man must finally be thrown back on his own resources.

یہ الفاظ علامہ کے انگریزی خطبات میں اس مضمون میں ہیں جس میں انہوں نے مسلم ثقافت کی روح پر بحث کی ہے۔ ان الفاظ کا سیاق یہ ہے کہ آپ زمانہ قدیم اور زمانہ جدید کے تقاضوں کا جائزہ لیتے ہوے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وحی الٰہی قدیم زمانے میں انسان کو انگلی سے پکڑ کر چلنا سکھاتی تھی لیکن آج وحی الٰہی کائنات کے مطالعے اور انسان کے اپنے گہرے باطن کو سمجھنے کی سعی پر مشتمل ہے۔ اب انسان کو اسکے اپنے ذرائع سے وہ کچھ حاصل ہوسکتا ہے جو کبھی اسے خدا کی طرف سے وحی کی صورت میں حاصل ہوتا تھا۔ زندگی کو ہمیشہ انگلی پکڑ کر نہیں چلنا ہے۔ اسے خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے۔ انسان کو مکمل خود آگہی کی منزل پر لانے کیلئے اس کے اپنے ذرائع پر چھوڑنا ضروری ہے۔ گویا بنی نوع انسان بحیثیت مجموعی اپنے لئے نئی راہیں تلاش کر سکتے ہیں۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ کام کب کا شروع ہو چکا ہے۔ اب ان منابع علم سے استفادے کا کام انسان واقعتاً کر رہا ہے اور حیرت انگیز نتائج تک پہنچ رہا ہے۔ اس میں رسمی

طور پر مذہبی ہونے یا نہ ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ آج انسان اس رسمی مذہبی وابستگی سے بالاتر ہوکر اصلی اور حقیقی وابستگی سے فیضیاب ہو رہا ہے۔

آج بھی انسان کی اصلی اور حقیقی وابستگی کائنات کی اس ازلی حقیقت سے ہے جو مذہب کے حوالے سے انسان کی طفولیت کے دور میں اسکی تربیت کرتی رہی ہے۔ وہی حقیقت لم یزل آج بھی انسانی معاشرے کی ربوبیت کر رہی ہے جو پہلے نبوی انداز میں اسکی تربیت کرتی تھی۔ ایک بات جو انسان کے انفرادی دائرے سے نکل کر اجتماعی دائرے میں داخل ہوتے ہی شروع ہو جاتی ہے وہ ہے ایک انسان کا دوسرے انسانوں سے تعلق اور اسکا اس تعلق کو نبھانے کا سلیقہ۔

جب تک انسان اور خدا کے درمیان انفرادی اور مذہبی معاملہ تھا انفرادیت کا دور دورہ تھا۔ لیکن آج ہم ایک ایسے ماحول میں رہتے ہیں جس میں انسان اور خدا کا معاملہ تو انسان کا ذاتی مسئلہ رہ گیا ہے اور انسان اور انسان کا مسئلہ اجتماعی نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ ایک دور تھا جب انسان کا تعلق دوسرے انسانوں سے ایک قبیلے یا ایک قوم کی شکل میں ہوتا تھا۔ اور اس قبیلے یا قوم کا مذہب ایک ہی ہوتا تھا۔ اس لئے انسان کا اپنے قبیلے یا اپنی قوم کے ساتھ تعلق بھی مذہب کی تعلیمات سے پورا ہو جاتا تھا۔ اب صورت حالات یکسر بدل گئی ہے۔

اب یا تو ہر مذہب اپنی تعلیمات کو دوسروں پر عائد کرے گا یا تمام دنیا کے لوگوں کو ایک مذہب کی پیروی کرنا ہوگی۔ اور اس طرح مذہب کی بقا کا اہتمام کرنا ہوگا۔ لیکن کیا کوئی قوم اس پر تیار ہے کہ اپنے مذہب کی تعلیمات کو اس طرح ترتیب دے لے کہ وہ تمام اقوام عالم کو منظور ہوں؟ یا کیا تمام دنیا کے لوگ اس پر تیار ہیں کہ وہ کسی ایک مذہب کی پیروی کرنا شروع کر دیں؟ میری ناقص رائے میں ان دونوں ہی باتوں کیلئے دنیا کے لوگ تیار نہیں ہیں۔

تو یہ بات ضروری ہوگئی ہے کہ انسان اپنے خدا کے ساتھ جو انفرادی تعلق رکھتا ہے اسکی حفاظت کرتے ہوئے ہم سب انسانوں کو اس باہمی رابطے سے فائدہ اٹھانا چاہئے جو فی

زمانہ ہمیں حاصل ہے۔اور انسان ایسا کرنے سے اپنے خدا کے ساتھ تعلق میں کسی کوتاہی کا مرتکب نہیں ہوگا کیونکہ یہ تمام تگ و دو اس ایمان کے بغیر ممکن نہیں ہے جو انسان کے گہرے باطن میں خدا اب بھی موجزن کئے ہوئے ہے۔اس طرح دیکھیں تو جو حقیقی طور پر انسانیت کی خدمت کرنے والی جتنی بین الاقوامی تنظیمیں آج وجود میں آچکی ہیں انہیں رحمت سمجھتے ہوئے اس سلسلے میں انسان کو اپنی مساعی میں مزید آگے بڑھنا چاہئے اور انسانی حقوق کے تحفظ اور ضمانت کیلئے جو کچھ ہوسکتا ہے کیا جانا چاہئے۔

لیکن ایک بات یہاں احتیاط کے طور پر ضرور سمجھ لینی چاہئے کہ سرمایہ داری کے دام میں آکر مستحق لوگ ان بین الاقوامی تنظیموں کی برکت سے محروم نہ ہو جائیں۔سرمائے میں ایک ایسی طاقت ہوتی ہے جو سرمایہ داروں کے ذاتی مفادات کا تحفظ کچھ اس طرح کرسکتی ہے کہ اصل حقداروں کے حقوق کی بازیابی بعض صورتوں میں ناممکن ہو جاتی ہے۔اس خطرے کو جتنی جلد بھانپ لیا جائے بہتر ہوگا۔